ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1905

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: عربی ادب (عربی لٹریچر) (1905)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1 تا 5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی متعلقہ اکائیوں کا مطالعہ کریں اور اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں؛ کسی بھی تیار شدہ مواد کی ہو بہو نقل سے گریز کریں۔

سوال نمبر 1: الرحمٰن اور الرحیم کے صیغۂ مبالغہ ہونے سے اللہ کی رحمت کا کون سا تصور ابھرتا ہے؟ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: الرحمٰن اور الرحیم کے صیغۂ مبالغہ ہونے سے اللہ کی رحمت کا کون سا تصور ابھرتا ہے؟

تعارف

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں "الرحمٰن" اور "الرحیم" کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ دونوں نام بسم اللہ میں سب سے پہلے آتے ہیں، سورۃ الفاتحہ میں بھی اسی ترتیب سے مذکور ہیں اور مسلمان دن میں بار بار دہراتا ہے۔ جب ہم ان الفاظ کے صرفی ڈھانچے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں صیغۂ مبالغہ ہیں، یعنی ان میں رحمت کے معنی محض سادہ صفت کے طور پر نہیں بلکہ کثرت، گہرائی اور فراوانی کے ساتھ موجود ہیں۔ یہی صرفی حقیقت اللہ کی رحمت کے بارے میں ایک جامع اور متوازن تصور اجاگر کرتی ہے۔ اس سوال کے جواب میں ہم پہلے "رحمت" کے لغوی مفہوم کو سمجھیں گے، پھر صیغۂ مبالغہ کی تعریف بیان کریں گے، اس کے بعد الرحمٰن اور الرحیم کے الگ الگ مفاہیم اور ان کے اجتماع سے پیدا ہونے والے مجموعی تصورِ رحمت کو دلائل و شواہد کے ساتھ واضح کریں گے۔

لفظ "رحمت" کا لغوی پس منظر

عربی زبان میں لفظ "رحمت" کا مادّہ "ر ح م" ہے جس سے "رَحِم" یعنی ماں کا پیٹ بھی بنا ہے۔ اہلِ لغت کے نزدیک رحمت کا اصل مفہوم دل کی نرمی، شفقت اور وہ لطیف جذبہ ہے جو کسی کی حاجت روائی اور اس کے نقصان کو دور کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ماں کے پیٹ کو "رحم" اسی لیے کہا گیا کہ وہ بچے کے لیے حفاظت، غذا اور پرورش کا مکمل انتظام کرتا ہے۔ لغت کی اسی مناسبت سے قرآن مجید نے صلۂ رحمی، یعنی قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک، کو بھی اسی مادّے سے جوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے رحمت اس کے انسانی مفہوم کی مکمل شکل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بندوں پر انعام و احسان، ان کی حاجات کی تکمیل اور ان پر فضل و کرم کا فیضان ہے۔ چنانچہ "رحمٰن" اور "رحیم" دونوں اسی مادّے سے مشتق ہیں، لیکن دونوں کے اوزان مختلف ہیں اور ہمیں اوزان کا فرق معنی میں خوبصورت تنوع پیدا کرتا ہے۔

صیغۂ مبالغہ کی تعریف اور اہمیت

علمِ صرف میں صیغۂ مبالغہ سے مراد وہ صیغہ ہے جس میں کسی صفت کا معنی کثرت اور شدت کے ساتھ پایا جائے۔ مثلاً "غفّار"، "علّام"، "صبّار" وغیرہ۔ مبالغے کی یہ تعبیر دو پہلو رکھتی ہے: ایک یہ کہ صفت کا ظہور بار بار اور بکثرت ہو، اور دوسرا یہ کہ صفت اپنی کیفیت اور گہرائی میں کمال کو پہنچی ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء جب صیغۂ مبالغہ پر آئیں تو ان

سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفت اللہ کے لیے ذاتی، دائمی اور بے پایاں ہے، مخلوق کی طرح عارضی اور محدود نہیں۔ "الرحمٰن" کا وزن "فَعْلَان" ہے جس پر مبالغے کے الفاظ جیسے "شَبْعَان"، "غَضْبَان" آتے ہیں اور یہ وزن صفت کے بھرپور اور وسیع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ "الرحیم" کا وزن "فَعِیْل" ہے جس پر "عَلِیْم"، "قَدِیْر"، "سَمِیْع" جیسے الفاظ آتے ہیں اور یہ وزن صفت کے ثبوت، دوام اور استقرار پر دلالت کرتا ہے۔ اس طرح صرفی اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مل کر رحمت کی وسعت اور اس کے دوام، دونوں کو بیک وقت بیان کرتے ہیں۔

"الرحمٰن" سے ابھرنے والا تصور: رحمت کی وسعت و عمومیت

"الرحمٰن" سے اللہ کی رحمت کا جو تصور سب سے پہلے ابھرتا ہے وہ اس رحمت کی بے پناہ وسعت اور ہر شے کو شامل ہونے کا ہے۔ مفسّرین لکھتے ہیں کہ رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت دنیا میں تمام مخلوقات کو عام ہے: مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، انسان ہو یا جن و حیوان، سب اس کی رحمت سے رزق، ہوا، پانی، صحت اور زندگی کی نعمتیں پاتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا: "وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" یعنی میری رحمت ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ "رحمٰن" اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے؛ اس وزن پر اس صفت کا اطلاق غیر اللہ پر جائز نہیں، کیونکہ ایسی وسیع و محیط رحمت صرف خالق ہی کی شان ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رحمٰن دنیا و آخرت دونوں میں رحمت کرنے والا ہے جب کہ اس کے بالمقابل رحیم کا مفہوم اگلے مرحلے میں بیان ہو گا۔ اس صیغے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رحمت اللہ کی وہ صفت ہے جو اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے، چنانچہ حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ نے کتاب لکھی ہے کہ "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے"۔

"الرحیم" سے ابھرنے والا تصور: رحمت کی گہرائی، دوام و خصوصیت

"الرحیم" کے صیغے سے رحمت کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے، یعنی اس کی گہرائی، استمرار اور خصوصی توجہ۔ "فعیل" کا وزن صفت کے دوام پر دلالت کرتا ہے، اس لیے رحیم وہ ہے جس کی رحمت مسلسل اور ہر آن بندوں کو پہنچتی رہتی ہے۔ اکثر مفسّرین کی رائے ہے کہ "رحیم" کی رحمت کا خصوصی ظہور اہلِ ایمان کے ساتھ ہو گا، دنیا میں ہدایت، توفیق اور گناہوں کی مغفرت کی صورت میں اور آخرت میں دخولِ جنت اور ابدی نعمتوں کی صورت میں۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا: "وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا" یعنی اللہ مومنوں

پر خاص طور پر رحیم ہے۔ فرق اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ رحمٰن تو بادشاہ کی اس عام فیاضی کی طرح ہے جس کے دستر خوان سے پورا شہر کھاتا ہے، اور رحیم اس خاص شفقت کی طرح ہے جو وہ اپنے مقربین اور فرمانبرداروں پر مستقل رکھتا ہے۔ رحیم کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ رحمت محض دنیوی نعمتوں تک محدود نہیں بلکہ گناہ گار کی توبہ قبول کرنا، دل کو سکون دینا اور آخرت میں بخش دینا بھی اسی کا فیضان ہے۔

دونوں صیغوں کے اجتماع سے مکمل تصور

جب الرحمٰن اور الرحیم اکٹھے آتے ہیں تو اللہ کی رحمت کا نہایت متوازن اور جامع تصور سامنے آتا ہے۔ ذیل کی جدول اس اجتماع کا خلاصہ پیش کرتی ہے:

جدول: الرحمٰن اور الرحیم کا تقابلی مفہوم

پہلو	الرحمٰن	الرحیم
صرفی وزن	فَعْلَان (مبالغہ)	فَعِیْل (مبالغہ / صیغۂ صفتِ مشبہ)
نمایاں مفہوم	رحمت کی وسعت اور کثرت	رحمت کا دوام، گہرائی اور خصوصیت
دائرۂ رحمت	تمام مخلوقات، بلا استثنا	خصوصاً اہلِ ایمان
ظہور کا میدان	بطورِ خاص دنیا کی عام نعمتیں	ہدایت، مغفرت اور آخرت کی نعمتیں
اطلاق	صرف اللہ کے لیے خاص	مخلوق کے لیے بھی بطورِ صفت استعمال ہو سکتا ہے

قرآنی شواہد اور مفسّرین کی آراء

قرآن مجید کی متعدد آیات اس تصور کی تائید کرتی ہیں۔ سورۃ الانعام میں فرمایا: "كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" یعنی اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت اس کے جود و کرم کا وہ اصول ہے جسے اس نے خود اپنی شان کے مطابق اختیار فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کو "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کہا گیا، یعنی بعثتِ نبوی خود اسی رحمتِ محیط کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ تفسیرِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ رحمٰن میں رحمت کی کمیت اور مقدار کا مبالغہ ہے اور رحیم میں اس کی کیفیت و دوام کا۔ امام زمخشری کے نزدیک بھی رحمٰن ابلغ ہے کیونکہ اس کی رحمت کا دائرہ وسیع تر ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے متعدد آثار نقل کر کے یہی خلاصہ دیا ہے کہ دونوں نام مل کر بتاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت نہ صرف سب کو شامل ہے بلکہ اپنے بندوں کے ساتھ خصوصی تعلق بھی رکھتی ہے۔ اس طرح صیغۂ مبالغہ کا استعمال سکھاتا ہے کہ اللہ کی رحمت محض ایک جذباتی صفت نہیں بلکہ ایک فعال اور مسلسل نظامِ احسان ہے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ فیض پا رہا ہے۔

بندے کے لیے عملی پیغام

اس تصورِ رحمت کے انسانی زندگی پر گہرے عملی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پہلا اثر امید کا ہے: جو خدا اس قدر رحیم ہے اس کی رحمت سے مایوسی کفر کے مترادف قرار دی گئی ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ دوسرا اثر رجوع و توبہ کا ہے؛ بندہ جب جانتا ہے کہ خالق کی رحمت گناہوں سے بڑی ہے تو وہ پلٹ آتا ہے۔ تیسرا اثر یہ ہے کہ بندہ خود بھی رحمت کا مظہر بنے؛ حدیث میں ہے کہ "رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم فرماتا ہے، زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا"۔ چوتھا اثر شکر گزاری کا ہے کیونکہ رحمت کی یہ وسعت احسان شناسی کا تقاضا کرتی ہے۔ یوں یہ دو الفاظ محض عقیدے کی باریکی نہیں رہتے بلکہ انسان کے کردار کی تعمیر کا پروگرام بن جاتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ الرحمٰن اور الرحیم کے صیغۂ مبالغہ ہونے سے اللہ کی رحمت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ چار جہتوں پر مشتمل ہے: رحمت بے پایاں وسیع ہے اور ہر شے کو شامل ہے؛ وہ اپنی کیفیت میں گہری اور دائمی ہے؛ وہ دنیا میں سب کے لیے عام اور ایمان والوں کے لیے آخرت میں خاص ہے؛ اور وہ غضب پر غالب اور بندوں کے لیے امید و رجوع کا دروازہ ہے۔ یہ تصور اسلامی الٰہیات کی بنیاد ہے اور اسی لیے قرآن کی تلاوت اور ہر برکت کام کی ابتدا انہی دو ناموں سے ہوتی ہے تاکہ بندہ ہر لمحہ اپنے رب کو رحمت کے آئینے میں دیکھے۔

سوال نمبر 2: "لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" سے اخذ کرنے والے فقہی و اخلاقی اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 2: "لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" سے فقہی اور اخلاقی اصول کیسے اخذ ہوتے ہیں؟

تعارف

سورۃ الحجرات کو اہلِ علم "سورۃ الآداب" بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں اجتماعی زندگی کے آداب، باہمی حقوق اور نبی کریم ﷺ کے احترام کی تعلیمات نہایت جامع انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ اس سورۃ کی پہلی آیت یہ ہے: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ" یعنی اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ آیت بظاہر ایک ادب کی تعلیم ہے لیکن اصولِ فقہ اور اخلاق کے ماہرین نے اس سے فقہی اور اخلاقی دونوں نوعیت کے متعدد اصول اخذ کیے ہیں۔ اس جواب میں پہلے آیت کے مفہوم و پس منظر کو واضح کیا جائے گا، پھر فقہی اصول اور پھر اخلاقی اصول ترتیب سے بیان کیے جائیں گے۔

آیت کا مفہوم اور پس منظر

"تقدیم" کے معنی ہیں کسی سے آگے بڑھ جانا، سبقت کرنا یا کسی کے حکم سے پہلے خود فیصلہ کر لینا۔ "بین یدی اللہ ورسولہ" کا مفہوم مفسّرین نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ کے حکم اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے مقابلے میں اپنی رائے، خواہش یا عجلت کو مقدم نہ کرو۔ شانِ نزول کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں: ایک یہ کہ بنو تمیم کا وفد مسجد نبوی میں ایسے وقت آیا جب نبی ﷺ آرام فرما رہے تھے اور صحابہ نے امیر کے انتخاب میں اپنی اپنی رائے دینی شروع کر دی؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قعقاع بن معبد کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اقرع بن حابس کی سفارش کی، اور اسی اختلاف پر یہ آیت نازل ہوئیں۔ بعض مفسّرین نے اسے عام حکم قرار دیا ہے کہ دین کے کسی معاملے میں قرآن و سنت کے فیصلے سے پہلے زبان یا عمل سے سبقت نہ کی جائے۔ عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے خطبے سے پہلے قربانی کر لینے والوں کو جو دوبارہ قربانی کا حکم ملا، اسے بھی اسی اصول کی عملی مثال سمجھا جاتا ہے۔

فقہی اصول: نص کے مقابلے میں رائے و قیاس کی ممانعت

اس آیت سے پہلا اور بنیادی فقہی اصول یہ نکلتا ہے کہ جہاں کتاب و سنت کا واضح حکم موجود ہو وہاں ذاتی رائے، قیاس یا عرف کو اس کے مقابلے میں پیش کرنا جائز نہیں۔ اصولیین اسے یوں تعبیر کرتے ہیں کہ "نص کی موجودگی میں اجتہاد کو دخل نہیں"۔ دوسرا اصول سنتِ رسول کی حجیت کا ہے: رسول ﷺ کا قول، فعل اور فیصلہ بھی اسی طرح واجب الاتباع ہے جس طرح قرآن کا حکم، کیونکہ آیت نے اللہ اور رسول دونوں کے آگے بڑھنے سے منع کیا ہے۔ تیسرا اصول اجتہاد کی حدود و آداب کا ہے؛ اجتہاد صرف وہاں ہو گا جہاں نص موجود نہ ہو، اور اس میں بھی قرآن و سنت کے مزاج اور مقاصد کو مقدم رکھا جائے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی مشہور حدیث اسی ترتیب کی عملی صورت ہے: پہلے کتاب اللہ، پھر سنتِ رسول، پھر اجتہادِ رائے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ فتویٰ دینے اور فیصلہ کرنے میں جلد بازی ممنوع ہے؛ صحابہ کرام فتویٰ دینے سے گریز کرتے اور ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے تھے، جو اسی آیت کے ادب کی عملی تصویر ہے۔ پانچواں اصول سدِّ ذرائع کا ہے، یعنی ایسی بات یا عمل سے بھی بچنا جو بالآخر نص کی مخالفت تک پہنچا دے۔

فقہی اصولوں کی مزید تفصیل

اس آیت سے فقہاء نے قضاو حکومت کے باب میں بھی اصول اخذ کیے ہیں۔ قاضی اور حاکم کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی مقدمے میں شریعت کے حکم سے پہلے ذاتی پسند، دباؤ یا سفارش کی بنیاد پر فیصلہ صادر نہ کرے۔ مشاورت شرعاً درست اور پسندیدہ ہے، لیکن مشورے کی حیثیت مشورے کی ہے؛ فیصلے کی بنیاد وحی کی ہدایت ہی ہونا چاہیے۔ اسی طرح مقلد کے لیے یہ اصول ہے کہ وہ اپنے امام کے قول کو بھی نص کے مقابلے میں حجت نہ بنائے؛ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ عبادات کے باب میں بھی یہی اصول کارفرما ہے: نماز، روزہ، حج اور قرآن کے اوقات و طریقے توقیفی ہیں، ان میں اپنی طرف سے تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں۔ فقہاء نے یہ بھی اخذ کیا کہ بدعت کی مذمت کی جڑ یہی ہے، کیونکہ بدعت درحقیقت دین میں رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھ کر اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا نام ہے۔ یوں یہ ایک آیت فقہ کے پورے نظامِ مصادر و ترجیح کی بنیاد بن جاتی ہے۔

اخلاقی اصول: ادب، تواضع اور عجلت سے پرہیز

اخلاقی اعتبار سے اس آیت کا پہلا اصول ادب و احترام ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آگے بڑھنا بے ادبی تھا، اسی طرح اہلِ علم، والدین، اساتذہ اور بزرگوں کے سامنے ادب کا لحاظ ایمان کی علامت ہے۔ اگلی آیت میں آواز بلند کرنے کی ممانعت اسی اصول کی توسیع ہے، اور اسی تناظر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد اپنی آواز اس قدر دھیمی کر لی تھی کہ بات دوبارہ سناؤ نا پڑتی تھی۔ دوسرا اصول تواضع اور انانیت کا ترک ہے؛ "میری رائے" کو دین پر مقدم کرنا خود پسندی ہے، جب کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ حق کے سامنے سر جھکا دے۔ تیسرا اصول عجلت سے پرہیز ہے: فیصلوں، تنقیدوں اور تبصروں میں جلد بازی اخلاقی کمزوری ہے۔ چوتھا اصول اختلاف کے آداب ہیں؛ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اختلاف کیا مگر حدودِ ادب پار نہ کیں اور جب آیت نازل ہوئی تو دونوں نے ندامت و رجوع کیا، جو ہمیں سکھاتا ہے کہ اختلافِ رائے کو انا کی جنگ نہیں بنانا چاہیے۔ پانچواں اصول تقویٰ ہے جس پر آیت کا اختتام ہوا: "وَاتَّقُوا اللّٰہَ" یعنی بیرونی دباؤ نہیں بلکہ خدا خوفی ہی اصل ضامنِ ادب ہے۔

عصرِ حاضر میں اطلاق

آج کے دور میں اس آیت کی عملی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ سماجی رابطے کے ذرائع پر ہر شخص دینی مسائل پر بے تحقیق رائے دینے لگتا ہے، حالانکہ یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ پہلے علم حاصل کرو، اہلِ علم سے رجوع کرو، پھر بات کرو۔ انٹرنیٹ پر فتووں کی تلاش اور ڈاکٹروں و وکلاء کی طرح ماہرین سے مشورے کی ثقافت بھی اسی اصول کے تحت آتی ہے کہ غیر ماہر کی "تقدیم" نقصان دہ ہے۔ خاندانی اور ادارہ جاتی زندگی میں بھی یہ اصول نافذ ہوتا ہے: بزرگوں اور ذمہ داروں کے فیصلوں سے پہلے توڑ پھوڑ کی باتیں کرنا، یا اجتماعی نظم کے مقابل انفرادی خواہش کو مقدم رکھنا، اسی ممنوع سبقت کی صورتیں ہیں۔ اسی طرح جدید قانون سازی اور میڈیا مباحث میں مسلمان دانشور کے لیے یہ معیار مقرر رہوتا ہے کہ وہ دنیوی نظریات کو پرکھے ضرور، مگر دین کے قطعی احکام کو ان کے تابع نہ کرے۔ یوں یہ آیت علم، ادب اور نظم وضبط تینوں کی مشترکہ بنیاد بن جاتی ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ "لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ" سے فقہی میدان میں نص کی حاکمیت، سنت کی حجیت، اجتہاد کی حدود، فتوے میں احتیاط اور بدعت کی ممانعت جیسے اصول نکلتے ہیں، اور اخلاقی میدان میں ادب و احترام، تواضع، ترکِ عجلت، اختلاف کے آداب اور تقویٰ جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ یہ آیت دراصل پورے اسلامی طرزِ زندگی کا دستور العمل ہے کہ انسان اپنی رائے کو وحی کے تابع رکھے اور اپنے کردار کو ادب کے رنگ میں رنگ لے۔

سوال نمبر 3: "الرحمٰن، علّم القرآن" میں ترتیبِ الفاظ سے رحمت اور ہدایت کا ربط (20 نمبر)

سوال نمبر 3: الرحمٰن، علّم القرآن میں ترتیبِ الفاظ سے اللہ کی رحمت اور ہدایت کا کیا ربط ظاہر ہوتا ہے؟

تعارف

سورۃ الرحمٰن کو حدیث میں "عروس القرآن" یعنی قرآن کی دلہن کہا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتدائی چار آیات یہ ہیں: "اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ"۔ بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی آیات ہیں لیکن ان کی ترتیب میں ایک عظیم حکمت پوشیدہ ہے: سب سے پہلے اللہ کا نام "الرحمٰن" آیا، پھر قرآن کی تعلیم کا ذکر ہوا، پھر انسان کی تخلیق اور پھر اسے بیان یعنی اظہار کی صلاحیت سکھانے کا تذکرہ ہوا۔ مفسرین نے اس ترتیب پر خاص توجہ دی ہے کیونکہ قرآنی اسلوب میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر اتفاقی نہیں ہوتی بلکہ مقصدی ہوتی ہے۔ اس جواب میں اسی ترتیب کو مرحلہ وار سمجھا جائے گا اور رحمت و ہدایت کے باہمی ربط کو واضح کیا جائے گا۔

ترتیب کا مرحلہ وار جائزہ

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کلام کا آغاز "الرحمٰن" سے ہوا۔ سورت کا نام بھی اسی اسم سے ماخوذ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے بیان ہونے والی تمام نعمتیں اسی رحمت کا فیضان ہیں۔ دوسرا مرحلہ "عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ" ہے، یعنی اس رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سورت کی تمام نعمتوں سے پہلے رکھا گیا، حالانکہ ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے انسان کی تخلیق پہلے ہونی چاہیے تھی اور تعلیم بعد میں۔ تیسرا مرحلہ "خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ" ہے، جس میں انسان کی پیدائش کا ذکر ہے۔ چوتھا مرحلہ "عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ" ہے؛ "بیان" سے مراد وہ صلاحیت ہے جس سے انسان اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے، معنی کو سمجھتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اس ترتیب میں سب سے نمایاں بات یہی ہے کہ تعلیمِ قرآن کو تخلیقِ انسان پر مقدم کیا گیا۔ اہلِ بلاغت کے نزدیک مقدم وہی شے ہوتی ہے جو زیادہ اہم ہو، پس ثابت ہوا کہ اللہ کے نزدیک انسان کی جسمانی تخلیق سے بڑھ کر اس کی روحانی ہدایت اہم ہے، اور ہدایت اس کی رحمت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

رحمت کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دینا

اس ترتیب سے پہلا ربط یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت رحمت سے پیدا ہوتی ہے اور رحمت ہی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ عام دنیوی نعمتیں بھی رحمت ہیں لیکن ان کی حیثیت وقتی اور جسمانی ہے، جب کہ قرآن کی ہدایت انسان کو دنیا و آخرت دونوں کی سعادت دیتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے خود کو بار بار "رحمت" قرار دیا: سورۃ یونس میں فرمایا گیا کہ قرآن

"شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ" ہے اور سورۃ الاسراء میں فرمایا "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ"۔ غور کیجیے کہ ان آیات میں بھی "ہدایت" اور "رحمت" ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو بھی "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کہا گیا کیونکہ آپ قرآن کی ہدایت لے کر آئے۔ پس سورۃ الرحمٰن کی ترتیب اس حقیقت کو لفظی تصویر بنا دیتی ہے کہ جس ذات نے رحمٰن ہونا اختیار کیا، اس کی رحمت کا پہلا اور سب سے بڑا تقاضا یہ تھا کہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو راستہ دکھائے۔

تخلیق سے پہلے ہدایت کے انتظام میں رحمت کی پیشگی مہربانی

دوسرا عمیق نکتہ یہ ہے کہ تعلیمِ قرآن کو خلقِ انسان سے پہلے ذکر کرنا اللہ کی اس مہربانی کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی ہدایت کا انتظام فرما لیا تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ماں بچے کی ولادت سے پہلے اس کی غذا اور پرورش کا سامان تیار کر لیتی ہے۔ انسانی تاریخ میں بھی یہی ترتیب ظاہر ہے: پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی ہدایت دی گئی اور فرمایا گیا کہ جب میری طرف سے ہدایت آئے تو جو اس کی پیروی کرے گا اس پر نہ خوف ہو گا نہ غم۔ اس سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں؛ اس کی تخلیق کا مقصد پہلے سے طے شدہ تھا اور وہ مقصد ہدایت کے تابع زندگی گزارنا ہے۔ رحمت کا کمال یہی ہے کہ وہ ضرورت پیدا ہونے سے پہلے اس کا انتظام کر دے۔ اس ترتیب سے عقیدۂ تقدیر کا مثبت پہلو بھی نکلتا ہے کہ انسانی زندگی حادثات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک رحیم خالق کے باقاعدہ منصوبے کا حصہ ہے۔

"بیان" کی نعمت: ہدایت کا ذریعہ اور رحمت کی تکمیل

چوتھی آیت "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" اس ربط کو مکمل کر دیتی ہے۔ قرآن کی تعلیم اس وقت ممکن ہے جب انسان میں سمجھنے اور ظاہر کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ بیان ہی وہ صلاحیت ہے جس سے انسان وحی کو سمجھتا ہے، اسے حفظ کرتا ہے، اس کی تفسیر کرتا ہے اور دوسروں تک تبلیغ پہنچاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک بیان سے مراد خیر و شر میں تمیز کی قوت ہے اور بعض کے نزدیک نطق و تحریر دونوں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے کہ بیان رحمت کا وہ ذریعہ ہے جس سے ہدایت انسان کے اندر اترتی ہے اور سماج میں پھیلتی ہے۔ یہاں بھی ترتیب قابلِ غور ہے: پہلے کتاب، پھر قاری، پھر قاری کی صلاحیت؛ گویا ہدایت کی قدر و قیمت کو صلاحیت سے بھی بڑھ کر بتایا گیا۔ عمرانی نقطۂ نظر سے زبان و بیان ہی وہ

بنیاد ہے جس پر تعلیم، قانون، ادب اور تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے، اور سورۃ الرحمٰن نے اسے ساری نعمتوں کی فہرست کا آغاز بنا کر بتایا کہ تہذیب کی جڑ بھی اللہ کی رحمت اور اس کی ہدایت ہے۔

مفسرین کی آراء کا خلاصہ

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیرِ کبیر میں اس ترتیب پر طویل بحث کی ہے اور کہا ہے کہ رحمٰن کا ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے قرآن کی تعلیم کا ذکر اس لیے آیا کہ نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت دین و ہدایت کی نعمت ہے، کیونکہ دنیوی نعمتیں فانی اور اخروی نعمتیں باقی ہیں۔ زمخشری نے کشاف میں اس انداز کو قرآن کی بلاغت کا نمونہ قرار دیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی آیات میں بڑے معانی سمو دیے گئے ہیں۔ امام قرطبی نے لکھا ہے کہ قرآن کی تعلیم کو مقدم کرنے کا اس اعتراض کا رد بھی ہے کہ قرآن کسی انسان نے سکھایا ہے؛ جواب دیا گیا کہ سکھانے والا رحمٰن ہے۔ ابنِ عاشور نے مقاصدی نگاہ سے دیکھا تو کہا کہ سورت کا مرکزی موضوع یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا سرچشمہ اس کی رحمت ہے اور ان نعمتوں کا سرتاج قرآن ہے۔ ان تمام آراء کا حاصل ایک ہے کہ ترتیبِ الفاظ عین مقصد کے تابع ہے اور اس سے رحمت و ہدایت لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ "الرحمٰن، علّم القرآن" کی ترتیب سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں: اول یہ کہ ہدایت اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے اس لیے سب نعمتوں سے پہلے مذکور ہوئی؛ دوم یہ کہ رحمت کا تقاضا ضرورت سے پہلے بندوبست کرتا ہے اس لیے تعلیمِ قرآن کا ذکر تخلیقِ انسان سے بھی پہلے رکھا گیا؛ سوم یہ کہ "بیان" جیسی صلاحیت بھی اسی رحمت کی عطا ہے جس کے ذریعے ہدایت انسان تک پہنچتی اور پھیلتی ہے۔ اس طرح یہ چار چھوٹی آیات دراصل پوری سورت کا خلاصہ ہیں کہ کائنات کی ہر نعمت رحمت سے شروع ہوتی ہے اور اس رحمت کی اعلیٰ ترین صورت ہدایتِ قرآن ہے۔

سوال نمبر 4: لفظِ حدیث کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں فکری فرق (20 نمبر)

سوال نمبر 4: لفظِ حدیث کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں کیا فکری فرق ہے؟

تعارف

علومِ اسلامیہ کی اصطلاحات عموماً عربی لغت سے آتی ہیں مگر شرعی استعمال کے بعد ان الفاظ کے مفہوم میں خصوصیت اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ لفظ "حدیث" اس کی عمدہ مثال ہے۔ بظاہر یہ ایک عام سا لفظ ہے جس کا مطلب بات یا خبر ہے، لیکن اصطلاح میں یہ اسلامی علوم کے ایک عظیم الشان علمی ذخیرے، بلکہ قرآن کے بعد دین کے دوسرے بڑے ماخذ کا نام ہے۔ سوال یہ ہے کہ دونوں مفاہیم کے درمیان "فکری" فرق کیا ہے، یعنی اس فرق سے سوچ کے بنیادی فرق کیا ظاہر ہوتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے لغوی مفہوم، پھر اصطلاحی مفہوم بیان کیا جائے گا اور پھر دونوں کے درمیان فکری فرق نکات کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

لغوی مفہوم

لفظ حدیث کا مادّہ "ح د ث" ہے جس کے معنی ہیں کسی شے کا نیا وجود میں آنا، تازہ ہونا یا واقع ہونا۔ اسی سے "حادیث" واقعے کو اور "حدیث" اس بات کو کہتے ہیں جو کہی جائے، خبر دی جائے یا بیان کی جائے۔ لغوی طور پر حدیث "قدیم" کی ضد ہے، اور اس کا اطلاق ہر نئی بات، گفتگو، قصے اور خبر پر ہوتا ہے، خواہ وہ سچی ہو یا جھوٹی، اہم ہو یا غیر اہم، بیداری کی ہو یا خواب کی۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اسی عام لغوی مفہوم میں بار بار آیا ہے: "هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى" یعنی کیا آپ کے پاس موسیٰ کی خبر پہنچی؛ "حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ" یعنی ابراہیم کے مہمانوں کا قصہ؛ اور "فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ" میں حدیث سے مراد کلام و بیان ہے۔ سورۃ الزمر میں خود قرآن کو "اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ" یعنی بہترین کلام کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغت کے پیمانے پر حدیث کا دروازہ بہت وسیع ہے اور اس میں کوئی دینی خصوصیت شامل نہیں۔

اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں حدیث کا مفہوم بہت زیادہ مخصوص اور منضبط ہے۔ محدثین کے نزدیک حدیث وہ قول، فعل، تقریر (یعنی کسی عمل پر سکوت اختیار کر کے اسے جائز قرار دینا) یا صفت ہے جس کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف کی جائے۔ اصولیین اور فقہاء کی تعریف میں وسعت ہے؛ ان کے نزدیک حدیث یا سنت سے مراد نبی ﷺ کا وہ قول، فعل اور تقریر ہے جس سے شرعی حکم ثابت ہو۔ اس اصطلاحی دنیا میں کئی اور تصورات جڑ جاتے ہیں: "خبر" ایک یا چند افراد کی روایت کو، "اثر" صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال کو اور "سند" روایت کے سلسلے کو کہتے ہیں۔ اصطلاحی حدیث کے ساتھ صحت و ضعف کا پورا علم "مصطلح الحدیث" وجود میں آیا جس میں راویوں کے حالات جانچنے کے لیے علمِ رجال، جرح و تعدیل اور علل حدیث جیسے فنون پیدا ہوئے۔ یوں ایک ہی لفظ جب اصطلاح بنا تو اس کے گرد ایک پورا علمی نظام قائم ہو گیا جو چودہ صدیوں سے محفوظ و متحرک ہے۔

فکری فرق: نکات کی صورت میں

اب دونوں مفاہیم کا فکری فرق ملاحظہ کریں۔ پہلا فرق عموم سے خصوص کا ہے: لغوی حدیث ہر بات ہے، اصطلاحی حدیث صرف وہ بات ہے جو رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہو۔ یہ انتقال بتاتا ہے کہ اسلام میں علم کا مرکز شخصیتِ رسول ہے، ہر رائے نہیں۔ دوسرا فرق زمانی تازگی بمقابلہ ابدی حجیت کا ہے: لغوی طور پر حدیث وقتی طور پر نئی ہوتی ہے اور پرانی ہو جاتی ہے، لیکن اصطلاحی حدیث چودہ سو سال پرانی ہونے کے باوجود ہر دور کے لیے تازہ حجت اور زندہ رہنما ہے۔ تیسرا فرق صدق و کذب کے امکان کا ہے: لغوی خبر سچی بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹی بھی، اس کے لیے کوئی جانچ لازم نہیں؛ اصطلاحی حدیث میں جب تک سند کی جانچ اور ثبوت کی شرائط پوری نہ ہوں، اسے حدیث ماننے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ چوتھا فرق مقصد کا ہے: لغوی حدیث کا مقصد اطلاع دینا ہے، اصطلاحی حدیث کا مقصد اتباع اور اقتدا ہے، یعنی وہ صرف معلومات نہیں بلکہ عمل کا حکم رکھتی ہے۔ پانچواں فرق درجۂ یقین کا ہے: لغوی سطح پر حدیث ظن کی دنیا سے تعلق رکھتی ہے، اصطلاحی سطح پر وہ دین کے قطعی نظامِ شریعت کا حصہ بن جاتی ہے۔

جدول: لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا موازنہ

پہلو	لغوی مفہوم	اصطلاحی مفہوم
دائرہ	ہر نئی بات، خبر، قصہ یا گفتگو	صرف نبی کریم ﷺ کے قول، فعل، تقریر وصفت کا انتساب
صدق کی شرط	سچ یا جھوٹ دونوں ممکن	سند کی جانچ اور ثبوت کی شرائط لازمی
حجیت	کوئی دینی حجیت نہیں	قرآن کے بعد دین کا دوسرا ماخذ اور شرعی حجت
مقصد	محض اطلاع و بیان	اتباع، اقتدا اور حکمِ شرعی کا استنباط
متعلقہ علوم	علمِ لغت و بلاغت	مصطلح الحدیث، علمِ رجال، جرح و تعدیل، فقہ و اصول

اس فکری فرق کی علمی و تاریخی اہمیت

یہ فکری فرق محض نظری نہیں، اس نے مسلمانوں کی علمی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے۔ جب "حدیث" اصطلاح بنی تو مسلمانوں نے انسانی تاریخ میں پہلی بار کسی شخصیت کے اقوال و افعال کو نسل در نسل محفوظ کرنے کے لیے اسناد کا عظیم الشان نظام وضع کر لیا۔ محدثین نے لاکھوں راویوں کے سوانح و حالات مرتب کیے اور سچے و جھوٹے کی پہچان کے ضوابط بنائے۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہوا کہ اصطلاحی حدیث کو معمول کی خبر نہیں سمجھا گیا بلکہ دین کی امانت سمجھا گیا۔ دوسری طرف یہی فرق ہمیں متن کے مطالعے میں احتیاط سکھاتا ہے: قرآن میں جہاں "حدیث" کا لفظ آئے تو وہاں اصطلاحی معنی مراد لینا غلطی ہو گی، اور جہاں علم حدیث کی کتابوں میں آئے تو وہاں لغوی معنی کافی نہیں ہو گا۔ فقہی اصطلاحات میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے: صلاۃ لغت میں دعا ہے مگر شریعت میں مخصوص ارکان والی عبادت؛ زکاۃ لغت میں پاکیزگی و بڑھوتری ہے مگر اصطلاح میں مقررہ شرح سے مال کا اخراج۔ اس سے یہ عمومی اصول ثابت ہوتا ہے کہ شریعت نے لغوی الفاظ کو لے کر ان میں معنی کی ارتقائی صورت پیدا کی، اور یہی ارتقا اسلامی فکر کی خصوصیت ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ لغوی حدیث ایک عام بات یا خبر ہے جس میں نہ حجیت ہے نہ ثبوت کی شرط، جبکہ اصطلاحی حدیث نبی کریم ﷺ کی طرف ثابت شدہ انتساب کا نام ہے جو دین کا مستند ماخذ اور عمل کی بنیاد ہے۔ فکری فرق یہ ہے کہ لغت کی سطح پر لفظ زمانے و تازگی سے وابستہ ہے، اصطلاح کی سطح پر وہ وحی کی حفاظت، شخصیتِ رسول کی مرکزیت اور امت کی علمی دیانت کی علامت بن جاتا ہے۔ اسی فرق کو سمجھے بغیر نہ قرآنی اصطلاحات درست سمجھے جا سکتے ہیں اور نہ علمِ حدیث کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر 5: حدیث "لاحسد الا علی اثنتین" میں رشک کی جائز حدود اور ان کی وجوہات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: حدیث "لاحسد الا علی اثنتین" میں رشک کو کن حدود میں جائز قرار دیا گیا ہے اور کیوں؟

تعارف

حسد ان اخلاقی بیماریوں میں سے ہے جن کی قرآن و سنت میں شدید مذمت آئی ہے، کیونکہ حسد کرنے والا دراصل اللہ کی تقسیم پر ناراض ہوتا ہے اور دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کرتا ہے۔ مگر اسی باب میں ایک مشہور حدیث ایسی بھی ہے جس میں دو صورتوں میں "حسد" کو جائز رکھا گیا ہے، اور اہلِ علم نے واضح کیا ہے کہ وہاں حسد سے مراد اصل حسد نہیں بلکہ "رشک" یعنی غبطہ ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس جواب میں حدیث کا متن و ترجمہ پیش کر کے حسد و رشک کا فرق واضح کیا جائے گا، پھر دونوں صورتوں کی حدود بیان کی جائیں گی اور آخر میں اس جواز کی حکمت و وجوہات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

حدیث کا متن و ترجمہ

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا"۔ ترجمہ: "حسد (رشک) صرف دو شخصوں پر جائز ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اسے حق کے راستے میں خرچ کرنے پر مقرر ہو گیا ہو (یعنی دل کھول کر راہِ حق میں لٹاتا ہو)، اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے

حکمت (علم و دانائی) دی ہو، پس وہ اسی کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہو۔" ایک دوسری روایت میں "حکمت" کی جگہ قرآن کے علم کا ذکر ہے کہ اللہ نے کسی کو قرآن عطا کیا تو وہ دن رات اس میں قیام کرتا ہے۔ ان روایات کے مجموعے سے دونوں نعمتیں واضح ہو جاتی ہیں: مال جو راہِ حق میں صرف ہو اور علم جو عمل و تعلیم کے ساتھ ہو۔

حسد اور رشک (غبطہ) کا فرق

شرعی اصطلاح میں حسد یہ ہے کہ انسان دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، چاہے وہ نعمت خود اسے ملے یا نہ ملے؛ یہ صفت حرام ہے اور حدیث میں اسے نیکیوں کو اس طرح کھا جانے والی کہا گیا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ رشک یا غبطہ اس سے الگ چیز ہے: اس میں انسان دوسرے جیسا بننے کی آرزو کرتا ہے مگر اس کی نعمت کے زوال کی خواہش نہیں کرتا، بلکہ چاہتا ہے کہ اللہ اسے بھی ویسی نعمت دے دے اور اس کا بھائی بھی اس نعمت سے بہرہ ور رہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "حسد" کا لفظ مجازاً غبطے کے معنی میں آیا ہے، کیونکہ حقیقی حسد کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا۔ یہ فرق اس سوال کی اصل کنجی ہے: حدیث نے حسد نہیں بلکہ حد بندی کے ساتھ رشک کو جائز رکھا ہے، اور یہ حد بندی ہی اس تعلیم کی خوبصورتی ہے کہ مثبت مقابلے کی حوصلہ افزائی کی گئی اور منفی جلن کو باہر رکھا گیا۔

پہلی حد: مال اور راہِ حق میں خرچ

پہلی صورت میں رشک کی اجازت اس شخص پر ہے جسے مال ملا ہو مگر چند حدود کے ساتھ۔ پہلی حد یہ ہے کہ مال حلال ذریعے سے حاصل ہوا ہو، کیونکہ حرام دولت پر رشک کا کوئی سوال نہیں۔ دوسری حد یہ ہے کہ وہ مال کو "حق" میں تباہ کرے، یعنی حدیث کے لفظ "هلكته في الحق" کے مطابق اسے نیکی کے کاموں میں دل کھول کر صرف کرے: صدقہ و خیرات، محتاجوں کی امداد، دینی و رفاہی منصوبے۔ تیسری حد نیت کی ہے: خرچ ریا و نمود کے لیے نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ چوتھی حد یہ ہے کہ رشک کرنے والا اس دولت مند کے زوال یا نقصان کی خواہش نہ رکھے، بلکہ صرف یہ چاہے کہ کاش میرے پاس بھی اتنا مال ہوتا تو میں بھی اسی طرح خرچ کرتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی

روایت میں اس تمنا کا پورا نقشہ موجود ہے کہ غریب صحابہ نے امیروں کی سعادت پر اسی مثبت انداز میں رشک کیا اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں فضلِ ذکر کی راہ دکھائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالی رشک کی بنیاد دولت پر نہیں، سخاوت پر ہے؛ محض امیر آدمی پر نہیں، خرچ کرنے والے امیر پر رشک جائز قرار دیا گیا۔

دوسری حد: علم و حکمت، عمل اور تعلیم

دوسری صورت علم و حکمت والے شخص پر رشک کی ہے اور یہاں بھی حدود مقرر ہیں۔ پہلی حد یہ ہے کہ علم نافع ہو، بالخصوص قرآن و سنت کا علم اور وہ دانائی جو انسان کو حق کی پہچان دے۔ دوسری حد یہ ہے کہ وہ علم صرف ذخیرہ نہ ہو بلکہ اس پر عمل ہو: "فَهُوَ يَقْضِي بِهَا" یعنی وہ اپنے فیصلوں اور زندگی میں اسی علم کے مطابق چلے۔ تیسری حد تعلیم و اشاعت ہے: "وَيُعَلِّمُهَا" یعنی وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائے، کیونکہ چھپایا ہوا علم اس حدیث کے مفہوم سے باہر ہے، بلکہ علم چھپانے پر سخت وعید آئی ہے۔ چوتھی حد یہ ہے کہ رشک کرنے والا عالم کی رسوائی یا اس کے علم کے زوال کی تمنا نہ کرے۔ علم پر رشک کا یہ درجہ اس لیے بھی بلند ہے کہ مال خرچ ہو کر ختم ہو جاتا ہے مگر علم پھیل کر بڑھتا ہے اور صدقۂ جاریہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ علم والے پر رشک مال والے پر رشک سے افضل ہے، کیونکہ علم کی نعمت دنیا و آخرت دونوں کی نعمتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

جائز قرار دینے کی وجوہات و حکمتیں

اب سوال یہ ہے کہ ان دو ہی صورتوں میں رشک کیوں جائز رکھا گیا؟ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ دونوں نعمتیں اپنے آپ تک محدود نہیں رہتیں بلکہ دوسروں کو نفع پہنچاتی ہیں؛ مال خرچ ہو کر معاشرے کی بھوک و حاجت دور کرتا ہے اور علم پھیل کر جہالت دور کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ رشک مقابلے کو نیکی کی طرف موڑ دیتا ہے؛ قرآن نے اسی جذبے کو "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" اور "وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ" کہہ کر سراہا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ دنیوی نعمتوں مثلاً حُسن، اقتدار، شہرت یا محض دولت پر رشک کی اجازت دی جاتی تو انسان فانی چیزوں کی دوڑ میں پڑ کر آخرت سے غافل ہو جاتا؛ شریعت نے اس کے برعکس رشک کا رُخ ان چیزوں کی طرف رکھا جن کا انجام اخروی سعادت ہے۔ چوتھی وجہ اصلاحِ نیت ہے: رشک کرنے والا درحقیقت اپنے لیے خیر کی طلب کر رہا ہوتا ہے، اور نیک نیتی پر بھی اجر ملتا ہے، حدیث کا مفہوم ہے کہ جس

نے نیکی کی نیت کی اس کے لیے اجر لکھ دیا جاتا ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس حدیث نے امت میں سخاوت اور علم دونوں کی قدر و قیمت بلند کر دی: مال دار کے لیے پیغام ہے کہ قابلِ رشک بننا ہے تو خرچ کرو، اور عالم کے لیے کہ قابلِ رشک تب ہو جب عمل و تعلیم ساتھ ہو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث "لا حسد الا علی اثنتین" میں رشک صرف دو امور کے اندر جائز رکھا گیا ہے: ایک اس مال پر جو حلال ہو اور راہِ حق میں بے دریغ خرچ ہوتا ہو، اور دوسرا اس علم و حکمت پر جو عمل اور تعلیم سے مزین ہو۔ اصل حسد، یعنی کسی کی نعمت کے زوال کی تمنا، ہر صورت حرام ہے۔ یہ اجازت اس لیے دی گئی کہ یہ دونوں نعمتیں نفع رساں اور آخرت ساز ہیں اور ان پر رشک انسان کو جلن کے بجائے نیکی کے مقابلے، سخاوت کی طلب اور علمی جستجو کی طرف لے جاتا ہے۔ یوں یہ حدیث منفی جذبے کو مثبت توانائی میں بدلنے کا بہترین نبوی اصول ہے۔